دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۱۷۷ تا ۱۸۲

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ
عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۗ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ
وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۗ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ
وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۗ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدٰى
بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي
الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۗ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ
بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾﴾

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس سورۂ مبارکہ میں کئی ایسی عظیم آیات آئی ہیں جو حجم کے اعتبار سے بھی اور معنی و حکمت کے اعتبار سے بھی بہت عظیم ہیں' جیسے دو رکوع پہلے ''آیت الآیات'' گزر چکی ہے۔ اسی طرح سے اب یہ ''آیت البر'' آ رہی ہے' جس میں نیکی کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں نیکی کے مختلف تصورات ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ وہ ہے جس کا نیکی کا تصور یہ ہے کہ بس سچ بولنا چاہیے' کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے' کسی کا حق نہیں مارنا چاہیے' یہ نیکی ہے' باقی کوئی نماز روزہ کی پابندی کرے یا نہ کرے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے! ایک طبقہ وہ ہے جس میں چور اُچکے' گرہ کٹ' ڈاکو اور بدمعاش شامل ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یتیموں اور بیواؤں کی مدد بھی کرتے ہیں اور یہ کام ان کے ہاں نیکی شمار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جسم فروش خواتین بھی اپنے ہاں نیکی کا ایک تصور رکھتی ہیں' وہ خیرات بھی کرتی ہیں اور مسجدیں بھی تعمیر کراتی ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی طبقات میں ایک طبقہ وہ ہے جو مذہب کے ظاہر کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور وہ اس کی روح سے ناآشنا ہوتا ہے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ''مچھر چھانتے ہیں اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہیں''۔ ان کے اختلافات اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ رفع یدین کے بغیر نماز ہوئی یا نہیں؟ تراویح آٹھ ہیں یا بیس ہیں؟ باقی یہ کہ سودی کاروبار تم بھی کرو اور ہم بھی' اس سے کسی کی حنفیت یا اہل حدیثیت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نیکی کے یہ سارے تصورات مسخ شدہ (perverted) ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اندھوں نے ایک ہاتھی کو دیکھ کر اندازہ کرنا چاہا تھا کہ وہ کیسا ہے۔ کسی نے اُس کے پیر کو ٹٹول کر کہا کہ یہ تو ستون کی مانند ہے' جس کا ہاتھ اُس کے کان پر پڑ گیا اُس نے کہا یہ چھاج کی طرح ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں نیکی کا تصور تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ بقول اقبال :ؔ

اڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

یہ آیت اس اعتبار سے قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے کہ نیکی کی حقیقت کیا ہے' اس کی جڑ بنیاد کیا ہے' اس کی روح کیا ہے' اس کے مظاہر کیا ہیں؟ پھر ان مظاہر میں اہم ترین کون سے ہیں اور ثانوی حیثیت کن کی ہے؟ چنانچہ اس ایک آیت کی روشنی میں قرآن کے علم الاخلاق پر ایک جامع کتاب تصنیف کی جا سکتی ہے۔ گویا اخلاقیاتِ قرآنی (Quranic Ethics) کے لیے یہ آیت جڑ اور بنیاد ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ یہ آیت یہاں کیونکر آئی ہے۔ اس کے پس منظر میں بھی وہی تحویلِ قبلہ ہے۔ تحویل قبلہ کے بارے میں چار رکوع (۱۵ تا ۱۸) تو مسلسل

ہیں۔اس سے پہلے چودھویں رکوع میں آیت آئی ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۱۵) اِدھر بھی اٹھارہویں رکوع کے بعد اتنی آیتیں چھوڑ کر یہ آیت آ رہی ہے۔فرمایا:

آیت ۱۷۷ ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو''

اس عمل کے نیکی ہونے کی نفی نہیں کی گئی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ کوئی نیکی ہی نہیں ہے۔ یہ بھی نیکی ہے۔نیکی کا جو ظاہر ہے وہ بھی نیکی ہے' لیکن اصل شے اس کا باطن ہے۔اگر باطن صحیح ہے تو حقیقت میں نیکی نیکی ہے' ورنہ نہیں۔

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ﴾ ''بلکہ نیکی تو اُس کی ہے''

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾ ''جو ایمان لائے اللہ پر' یوم آخرت پر' فرشتوں پر' کتاب پر اور نبیوں پر۔''

سب سے پہلے نیکی کی جڑ بنیاد بیان کر دی گئی کہ یہ ایمان ہے' تاکہ تصحیح نیت ہو جائے۔ ایمانیات میں سب سے پہلے اللہ پر ایمان ہے۔یعنی جو نیکی کر رہا ہے وہ صرف اللہ سے اجر کا طالب ہے۔ پھر قیامت کے دن پر ایمان کا ذکر ہوا کہ اس نیکی کا اجر دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مطلوب ہے۔ ورنہ تو یہ سوداگری ہوگئی۔اور آدمی اگر سوداگری اور دکانداری کرے تو دنیا کی چیزیں بیچے' دین تو نہ بیچے۔ دین کا کام کر رہا ہے تو اس کے لیے سوائے اُخروی نجات کے اور اللہ کی رضا کے کوئی اور شے مقصود نہ ہو۔ یوم آخرت کے بعد فرشتوں' کتابوں اور انبیاء (علیہم السلام) پر ایمان کا ذکر کیا گیا۔ یہ تینوں مل کر ایک یونٹ بنتے ہیں۔فرشتہ وحی کی صورت میں کتاب لے کر آیا' جو انبیاءِ کرامؑ پر نازل ہوئی۔ایمان بالرسالت کا تعلق نیکی کے ساتھ یہ ہے کہ نیکی کا ایک مجسمہ' ایک ماڈل' ایک آئیڈیل ''اسوۂ رسولؐ'' کی صورت میں انسانوں کے سامنے رہے۔ایسا نہ ہو کہ اونچ نیچ ہو جائے۔نیکیوں کے معاملے میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی جذبات میں ایک طرف کو نکل گیا اور کوئی دوسری طرف کو نکل گیا۔اس گمراہی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے کہ ایک مکمل اُسوہ سامنے رہے' جس میں تمام چیزیں معتدل ہوں اور وہ اُسوہ ہمارے لیے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے۔نیکی کے ظاہر کے لیے ہم آپؐ ہی کو معیار سمجھیں گے۔ جو شے جتنی آپؐ کی سیرت میں ہے' اُس سے زیادہ نہ ہو اور اُس سے کم نہ ہو۔

کوشش یہ ہو کہ انسان بالکل رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ کاملہ کی پیروی کرے۔

﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ ''اور وہ خرچ کرے مال اس کی محبت کے باوجود''

یعنی مال کی محبت کے علی الرغم۔ ''عَلٰی حُبِّہٖ'' میں ضمیر متصل اللہ کے لیے نہیں ہے بلکہ مال کے لیے ہے۔ مال اگرچہ محبوب ہے' پھر بھی وہ خرچ کر رہا ہے۔

﴿ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ ''قرابت داروں' یتیموں' محتاجوں' مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔''

گویا نیکی کے مظاہر میں اوّلین مظہر انسانی ہمدردی ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو نیکی کا وجود نہیں ہے۔ عبادات کے انبار لگے ہوں مگر دل میں شقاوت ہو' انسان کو حاجت میں دیکھ کر دل نہ پسیجے' کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تجوری کی طرف ہاتھ نہ بڑھے' حالانکہ تجوری میں مال موجود ہو' تو یہ طرزِ عمل دین کی روح سے بالکل خالی ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۹۲) میں الفاظ آئے ہیں:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ ''تم نیکی کے مقام کو پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو اس میں سے جو تمہیں محبوب ہے''۔ یہ نہیں کہ جس شے سے طبیعت اکتا گئی ہو' جو کپڑے بوسیدہ ہو گئے ہوں وہ کسی کو دے کر حاتم طائی کی قبر پر لات ماردی جائے۔ جو شے خود کو پسند ہو' عزیز ہو' اگر اس میں سے نہیں دیتے تو تم نیکی کو پہنچ ہی نہیں سکتے۔

﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ﴾ ''اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ۔''

حکمت دین ملاحظہ کیجیے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد آیا ہے۔ اس لیے کہ روحِ دین ''ایمان'' ہے اور نیکی کے مظاہر میں سے مظہر اوّل انسانی ہمدردی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیجیے کہ یہاں ''زکوٰۃ'' کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے' جبکہ اس سے قبل ایتائے مال کا ذکر ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکَاۃِ)) (۱)

''یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔''

یعنی اگر کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس ہم نے اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکال دی تو پورا حق ادا

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزکاۃ عن رسول اللہ ﷺ باب ما جاء ان فی المال حقا سوی الزکاۃ۔

ہوگیا' تو یہ ان کی خام خیالی ہے' مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ اور آپ ﷺ نے یہی مذکورہ بالا آیت پڑھی۔

ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ایمان کو تروتازہ رکھنے کے لیے نماز ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ (طٰہٰ) ''نماز قائم کرو میری یاد کے لیے''۔ اور انسانی ہمدردی میں مال خرچ کرنے کے جذبے کو پروان چڑھانے اور برقرار رکھنے کے لیے زکوٰۃ ہے کہ اتنا تو کم سے کم دینا ہوگا' تاکہ بوتل کا منہ تو کھلے۔ اگر بوتل کا کارک نکل جائے گا تو اُمید ہے کہ اس میں سے کوئی شربت اور بھی نکل آئے گا۔ چنانچہ اڑھائی فیصد تو فرض زکوٰۃ ہے۔ جو یہ بھی نہیں دیتا وہ مزید کیا دے گا؟

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ ''اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کرلیں۔''

انسان نے سب سے بڑا عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا جو ''عہد الست'' کہلاتا ہے' پھر شریعت کا عہد ہے جو ہم نے اللہ کے ساتھ کر رکھا ہے۔ پھر آپس میں جو بھی معاہدے ہوں ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ معاملاتِ انسانی سارے کے سارے معاہدات کی شکل میں ہیں۔ شادی بھی شوہر اور بیوی کے مابین ایک سماجی معاہدہ (social contract) ہے۔ شوہر کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں اور بیوی کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں۔ شوہر کے بیوی پر حقوق ہیں' بیوی کے شوہر پر حقوق ہیں۔ پھر آجر اور مستأجر کا جو باہمی تعلق ہے وہ بھی ایک معاہدہ ہے۔ تمام بڑے بڑے کاروبار معاہدوں پر ہی چلتے ہیں۔ پھر ہمارا جو سیاسی نظام ہے وہ بھی معاہدوں پر مبنی ہے۔ تو اگر لوگوں میں ایک چیز پیدا ہو جائے کہ جو عہد کرلیا ہے اسے پورا کرنا ہے تو تمام معاملات سدھر جائیں گے' ان کی stream lining ہو جائے گی۔

﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾ ''اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔''

یہ نیکی بدھ مت کے بھکشوؤں کی نیکی سے مختلف ہے۔ یہ نیکی باطل کو چیلنج کرتی ہے۔ یہ نیکی خانقاہوں تک محدود نہیں ہوتی' صرف انفرادی سطح تک محدود نہیں رہتی' بلکہ اللہ کو جو نیکی مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اب باطل کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آؤ۔ اور جب باطل کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آؤ گے تو خود بھی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ اس راہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی تکلیفیں

اٹھانی پڑی ہیں اور جانیں دینی پڑی ہیں۔ اللہ کا کلمہ سربلند کرنے کے لیے سینکڑوں صحابہ کرامؓ نے جامِ شہادت نوش کیا ہے۔ دنیا کے ہر نظام اخلاق میں ''خیرِاعلیٰ'' (summum bonum) کا ایک تصور ہوتا ہے کہ سب سے اونچی نیکی کیا ہے! قرآن کی رو سے سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ حق کے غلبے کے لیے' صداقت' دیانت اور امانت کی بالادستی کے لیے اپنی گردن کٹا دی جائے۔ وہ آیت یاد کر لیجیے جو چند رکوع پہلے ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں (جامِ شہادت نوش کر لیں) انہیں مردہ مت کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور حاصل نہیں ہے''۔

﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔''

راست بازی اور نیکوکاری کا دعویٰ تو بہت سوں کو ہے' لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

﴿وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ ''اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

ہمارے ذہنوں میں نیکی اور تقویٰ کے کچھ اور نقشے بیٹھے ہوئے ہیں کہ شاید تقویٰ کسی مخصوص لباس اور خاص وضع قطع کا نام ہے۔ یہاں قرآن حکیم نے نیکی اور تقویٰ کی حامل انسانی شخصیت کا ایک ہیولا اور اس کے کردار کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ اس کے باطن میں روحِ ایمان موجود ہے اور خارج میں اس ترتیب کے ساتھ دین کے یہ تقاضے اور نیکی کے یہ مظاہر موجود ہیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ' اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ (آمین یا ربّ العالمین)

اس کے بعد وہی جو انسانی معاملات ہیں ان پر بحث چلے گی۔ سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی کے مضامین کے بارے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ یہ گویا چار لڑیوں پر مشتمل ہیں' جن میں سے دو لڑیاں عبادات اور احکام و شرائع کی ہیں۔

آیت ۱۷۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ﴾ ''اے اہل ایمان! تم پر لازم کر دیا گیا ہے مقتولوں کا بدلہ لینا۔''

قَتْلٰی ''قَتِیْلٌ'' کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ ''کُتِبَ'' کے بعد ''عَلٰی'' فرضیت کے لیے آتا ہے' یعنی تم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے' اس معاملے میں سہل انگاری صحیح نہیں ہے۔ جب کسی معاشرے میں انسان کا خون بہانا عام ہو جائے تو تمدن کی جڑ کٹ جائے گی'

لہٰذا قصاص تم پر واجب ہے۔

﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ ''آزاد آزاد کے بدلے''

اگر کسی آزاد آدمی نے قتل کیا ہے تو قصاص میں وہ آزاد ہی قتل ہوگا۔ یہ نہیں کہ وہ کہہ دے کہ میرا غلام لے جاؤ' یا میری جگہ میرے دو غلام لے جا کر قتل کر دو۔

﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ ''اور غلام غلام کے بدلے''

اگر غلام قاتل ہے تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے گا۔

﴿وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ؕ﴾ ''اور عورت عورت کے بدلے۔''

اگر قتل کرنے والی عورت ہے تو وہ عورت ہی قتل ہوگی۔ قصاص و دیت کے معاملے میں اسلام سے پہلے عرب میں مختلف معیارات قائم تھے۔ مثلاً اگر اوسی خزرجی کو قتل کر دے تو تین گنا خون بہا وصول کیا جائے گا اور خزرجی اوسی کو قتل کرے تو ایک تہائی خون بہا ادا کیا جائے گا۔ یہ ان کا قانون تھا۔ اسی طرح آزاد اور غلام میں بھی فرق روا رکھا جاتا تھا۔ لیکن شریعت اسلامی نے اس ضمن میں کامل مساوات قائم کی اور زمانۂ جاہلیت کی ہر طرح کی عدم مساوات کا خاتمہ کر دیا۔ اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہی ہے کہ تمام مسلمان آپس میں ''کُفو'' (برابر) ہیں' لہٰذا قتل کے مقدمات میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

﴿فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ﴾ ''پھر جس کو معاف کر دی جائے کوئی شے اس کے بھائی کی جانب سے''

یعنی مقتول کے ورثاء اگر قاتل کو کچھ رعایت دے دیں کہ ہم اس کی جان بخشی کرنے کو تیار ہیں' چاہے وہ خون بہا لے لیں' چاہے ویسے ہی معاف کر دیں' تو جو بھی خون بہا طے ہوا ہو اُس کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ﴾ ''تو (اس کی) پیروی کی جائے معروف طریقے پر اور ادائیگی کی جائے خوبصورتی کے ساتھ۔''

﴿ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ﴾ ''یہ تمہارے ربّ کی طرف سے ایک تخفیف اور رحمت ہے۔''

اس کا رحمت ہونا بہت واضح ہے۔ اگر یہ شکل نہ ہو تو پھر قتل در قتل کا سلسلہ جاری رہتا

ہے۔ لیکن اگر قاتل کو لا کر مقتول کے ورثاء کے سامنے کھڑا کر دیا جائے کہ اب تمہارے ہاتھ میں اس کی جان ہے' تم چاہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا' اور اگر تم احسان کرنا چاہو' اس کی جان بخشی کرنا چاہو تو تمہیں اختیار حاصل ہے۔ چاہو تو ویسے ہی بخش دو' چاہو تو خون بہا لے لو۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ دشمنیوں کا دائرہ سمٹ جاتا ہے' بڑھتا نہیں ہے۔ اس میں اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہے۔ اسلامی معاشرے میں قاتل کی گرفتاری اور قصاص کی تنفیذ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے' لیکن اس میں مدعی ریاست نہیں ہوتی۔ آج کل ہمارے نظام میں غلطی یہ ہے کہ ریاست ہی مدعی بن جاتی ہے' حالانکہ مدعی تو مقتول کے ورثاء ہیں۔ اسلامی نظام میں کسی صدر یا وزیراعظم کو اختیار نہیں ہے کہ کسی قاتل کو معاف کر دے۔ قاتل کو معاف کرنے کا اختیار صرف مقتول کے ورثاء کو ہے۔ لیکن ہمارے ملکی دستور کی رو سے صدر مملکت کو سزائے موت معاف کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾﴾ ''تو اس کے بعد بھی جو حد سے تجاوز کرے گا تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد ظلم و زیادتی کا وطیرہ اپنائیں گے ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

آیت ۱۷۹ ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾

''اور اے ہوشمندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے' تاکہ تم بچ سکو۔''

معاشرتی زندگی میں عفو و درگزر اگرچہ ایک اچھی قدر ہے اور اسلام اس کی تعلیم دیتا ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾ (التغابن) ''اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے''۔ لیکن قتل کے مقدمات میں سہل انگاری اور چشم پوشی کو قصاص کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہیے' بلکہ شدت کے ساتھ پیروی ہونی چاہیے' تاکہ اس سے آگے قتل کا سلسلہ بند ہو۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ''تاکہ تم بچ سکو''۔ یعنی اللہ کی حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی سے بچو۔

آیت ۱۸۰ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ

﴿لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کر دیا گیا ہے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں انصاف کے ساتھ وصیت کرنا۔''

ابھی قانونِ وراثت نازل نہیں ہوا تھا' اس ضمن میں یہ ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔ دورِ جاہلیت میں وراثت کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی' جیسے آج بھی ہندوؤں میں ہوتی ہے' کہ مرنے والے کی ساری جائیداد کا مالک بڑا بیٹا بن جاتا تھا۔ اس کی بیوی' بیٹیاں' حتیٰ کہ دوسرے بیٹے بھی وراثت سے محروم رہتے۔ چنانچہ یہاں وراثت کے بارے میں پہلا حکم دیا گیا کہ مرنے والا والدین اور اقرباء کے بارے میں وصیت کر جائے تاکہ ان کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ پھر جب سورۃ النساء میں پورا قانونِ وراثت آ گیا تو اب یہ آیت منسوخ شمار ہوتی ہے۔ البتہ اس کے ایک جزو کو رسول اللہ ﷺ نے باقی رکھا ہے کہ مرنے والا اپنے ایک تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے' اس سے زیادہ نہیں' اور یہ کہ جس شخص کا وراثت میں حق مقرر ہو چکا ہے' اُس کے لیے وصیت نہیں ہوگی۔ وصیت غیر وارث کے لیے ہوگی۔ مرنے والا کسی یتیم کو' بیوہ کو' کسی یتیم خانہ کو یا کسی دینی ادارے کو اپنی وراثت میں سے کچھ دینا چاہے تو اسے حق حاصل ہے کہ ایک تہائی کی وصیت کر دے۔ باقی دو تہائی میں لازمی طور پر قانونی وراثت کی تنفیذ ہوگی۔

﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ ''اللہ تعالیٰ کا تقویٰ رکھنے والوں پر یہ حق ہے۔''

ان پر واجب اور ضروری ہے کہ وہ وصیت کر جائیں کہ ہمارے والدین کو یہ مل جائے' فلاں رشتہ دار کو یہ مل جائے' باقی جو بھی ورثاء ہیں ان کے حصے میں یہ آ جائے۔

آیت ۱۸۱ ﴿فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ﴾ ''تو جس نے بدل دیا اس وصیت کو اس کے بعد کہ اس کو سنا تھا''

﴿فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ﴾ ''تو اس کا گناہ ان ہی پر آئے گا جو اسے تبدیل کرتے ہیں۔''

وصیت کرنے والا ان کے اس گناہ سے بری ہے' اُس نے تو صحیح وصیت کی تھی۔ اگر گواہوں نے بعد میں وصیت میں تحریف اور تبدیلی کی تو اُس کا وبال اور اس کا بوجھ ان ہی پر

آئے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔''

آیت ۱۸۲ ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا﴾ ''پھر جس کو اندیشہ ہو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا''

اگر کسی کو یہ اندیشہ ہو اور دیانت داری کے ساتھ اس کی یہ رائے ہو کہ وصیت کرنے والے نے ٹھیک وصیت نہیں کی' بلکہ بے جا جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے یا کسی کی حق تلفی کر کے گناہ کمایا ہے۔

﴿فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ﴾ ''اور وہ ان کے مابین صلح کرا دے''

اس طرح کے اندیشے کے بعد کسی نے ورثاء کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ دیکھو ان کی وصیت تو یہ تھی' لیکن اس میں یہ زیادتی والی بات ہے' اگر تم لوگ متفق ہو جاؤ تو اس میں اتنی تبدیلی کر دی جائے؟

﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ ''تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔''

یعنی ایسی بات نہیں ہے کہ اس وصیت کو ایسا تقدس حاصل ہو گیا کہ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی' بلکہ باہمی مشورے سے اور اصلاح کے جذبے سے وصیت میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ

وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۚ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۗ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۗ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

سورۃ البقرۃ کے نصفِ آخر کے مضامین کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ چار لڑیوں کی مانند ہیں جو آپس میں گتھی ہوئی ہیں۔ اب ان میں سے عبادات والی لڑی آ رہی ہے اور زیرِ مطالعہ رکوع میں ''صوم'' کی عبادت کا تذکرہ ہے۔ جہاں تک ''صلوٰۃ'' (نماز) کا تعلق ہے تو اس کا ذکر مکی سورتوں میں بے تحاشا آیا ہے' لیکن مکی دور میں ''صوم'' کا بطور عبادت کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

عربوں کے ہاں صوم یا صیام کے لفظ کا اطلاق اور مفہوم کیا تھا اور اس سے وہ کیا مراد لیتے تھے' اسے ذرا سمجھ لیجیے! عرب خود تو روزہ نہیں رکھتے تھے' البتہ اپنے گھوڑوں کو رکھواتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر عربوں کا پیشہ غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ پھر مختلف قبائل کے مابین وقفہ وقفہ سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کاموں کے لیے ان کو گھوڑوں کی ضرورت تھی اور گھوڑا اس

مقصد کے لیے نہایت موزوں جانور تھا کہ اس پر بیٹھ کر تیزی سے جائیں' لوٹ مار کریں' شب خون ماریں اور تیزی سے واپس آ جائیں۔ اونٹ تیز رفتار جانور نہیں ہے' پھر وہ گھوڑے کے مقابلے میں تیزی سے اپنا رُخ بھی نہیں پھیر سکتا۔ مگر گھوڑا جہاں تیز رفتار جانور ہے' وہاں تنک مزاج اور نازک مزاج بھی ہے۔ چنانچہ وہ تربیت کے لیے ان گھوڑوں سے یہ مشقت کراتے تھے کہ ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے اور ان کے مُنہ پر ایک ''توبڑا'' چڑھا دیتے تھے۔ اس عمل کو وہ ''صوم'' کہتے تھے اور جس گھوڑے پر یہ عمل کیا جائے اسے وہ ''صائم'' کہتے تھے' یعنی یہ روزہ سے ہے۔ اس طرح وہ گھوڑوں کو بھوک پیاس جھیلنے کا عادی بناتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مہم کے دوران گھوڑا بھوک پیاس برداشت نہ کر سکے اور جی ہار دے۔ اس طرح تو سوار کی جان شدید خطرے میں پڑ جائے گی اور اسے زندگی کے لالے پڑ جائیں گے! مزید یہ کہ عرب اس طور پر گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر موسم گرما اور لُو کی حالت میں انہیں لے کر میدان میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے سروں پر ڈھاٹے باندھ کر اور جسم پر کپڑے وغیرہ لپیٹ کر اُن گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار رہتے تھے اور ان گھوڑوں کا مُنہ سیدھا لُو اور بادِ صرصر کے تھپیڑوں کی طرف رکھتے تھے' تاکہ اُن کے اندر بھوک پیاس کے ساتھ ساتھ لُو کے ان تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی عادت بھی پڑ جائے' تاکہ کسی ڈاکے کی مہم یا قبائلی جنگ کے موقع پر گھوڑا سوار کے قابو میں رہے اور بھوک پیاس یا بادِ صرصر کے تھپیڑوں کو برداشت کر کے سوار کی مرضی کے مطابق مطلوبہ رُخ برقرار رکھے اور اس سے مُنہ نہ پھیرے۔ تو عرب اپنے گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر جو مشقت کراتے تھے اس پر وہ ''صوم'' کے لفظ یعنی روزہ کا اطلاق کرتے تھے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہود کے ہاں روزہ رکھنے کا رواج تھا۔ وہ عاشورہ کا روزہ بھی رکھتے تھے' اس لیے کہ اس روز بنی اسرائیل کو فرعونیوں سے نجات ملی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ابتداءً ہر مہینے ''ایامِ بیض'' کے تین روزے رکھنے کا حکم دیا۔ اس رکوع کی ابتدائی دو آیات میں غالباً اسی کی توثیق ہے۔ اگر ابتدا ہی میں پورے مہینے کے روزے فرض کر دیے جاتے تو وہ یقیناً شاق گزرتے۔ ظاہر بات ہے کہ مہینے سخت گرم بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اگر تیس کے تیس روزے ایک ہی مہینے میں فرض کر دیے گئے ہوتے اور وہ جون جولائی کے ہوتے تو جان ہی تو نکل جاتی۔ چنانچہ بہترین تدبیر یہ کی گئی کہ ہر مہینے میں تین دن

کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا اور یہ روزے مختلف موسموں میں آتے رہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد رمضان کے روزے فرض کیے گئے۔ ہر مہینے میں تین دن کے روزوں کا جو ابتدائی حکم تھا اس میں علی الاطلاق یہ اجازت تھی کہ جو شخص یہ روزہ نہ رکھے وہ اس کا فدیہ دے' اگرچہ وہ بیمار یا مسافر نہ ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتا ہو۔ جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم آ گیا تو اب یہ رخصت ختم کر دی گئی۔ البتہ رسول اللہ ﷺ نے فدیہ کی اس رخصت کو ایسے شخص کے لیے باقی رکھا جو بہت بوڑھا ہے' یا کسی ایسی سخت بیماری میں مبتلا ہے کہ روزہ رکھنے سے اس کے لیے جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہے ان آیات کی تاویل جس پر میں بہت عرصہ پہلے پہنچ گیا تھا' لیکن چونکہ اکثر مفسرین نے یہ بات نہیں لکھی اس لیے میں اسے بیان کرنے سے جھجکتا رہا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی رائے یہی ہے تو مجھے اپنی رائے پر اعتماد ہو گیا۔ پھر مجھے اس کا ذکر تفسیر کبیر میں امام رازیؒ کے ہاں بھی مل گیا کہ متقدمین کے ہاں یہ رائے موجود ہے کہ روزے سے متعلق پہلی دو آیتیں (۱۸۳'۱۸۴) رمضان کے روزے سے متعلق نہیں ہیں' بلکہ وہ ایامِ بیض کے روزوں سے متعلق ہیں۔ ایامِ بیض کے روزے رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد بھی نفلاً رکھے ہیں۔

روزے کے احکام پر مشتمل یہ رکوع چھ آیتوں پر مشتمل ہے اور یہ اس اعتبار سے ایک عجیب مقام ہے کہ اس ایک جگہ روزے کا تذکرہ جامعیت کے ساتھ آ گیا ہے۔ قرآن مجید میں دیگر احکام بہت دفعہ آئے ہیں۔ نماز کے احکام بہت سے مقامات پر آئے ہیں۔ کہیں وضو کے احکام آئے ہیں تو کہیں تیمم کے' کہیں نمازِ قصر اور نمازِ خوف کا ذکر ہے۔ لیکن ''صوم'' کی عبادت پر یہ کل چھ آیات ہیں' جن میں اس کی حکمت' اس کی غرض و غایت اور اس کے احکام سب کے سب ایک جگہ آ گئے ہیں۔ فرمایا:

آیت ۱۸۳ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴾ ''اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ فرض کیا گیا تھا تم سے پہلوں پر تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے''۔

وہ جنگ کے لیے گھوڑے کو تیار کرواتے تھے' تمہیں تقویٰ کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ روزے کی مشق تم سے اس لیے کرائی جا رہی ہے تا کہ تم بھوک کو قابو میں رکھ سکو' شہوت کو قابو میں رکھ سکو' پیاس کو برداشت کر سکو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنا ہو گا' اس

میں بھوک بھی آئے گی' پیاس بھی آئے گی۔ اپنے آپ کو جہاد وقتال کے لیے تیار کرو۔ سورۃ البقرۃ کے اگلے رکوع سے قتال کی بحث شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ روزے کی یہ بحث گویا قتال کے لیے بطور تمہید آ رہی ہے۔

آیت ۱۸۴ ﴿اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ﴾ ''گنتی کے چند دن ہیں۔''

''مَعْدُوْدٰت'' جمع قلت ہے' جو تین سے نو تک کے لیے آتی ہے۔ یہ گویا اس کا ثبوت ہے کہ یہاں مہینے بھر کے روزے مراد نہیں ہیں۔

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ ''اس پر بھی جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو''

﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ ''تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔''

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ﴾ ''اور جو اِس کی طاقت رکھتے ہوں (اور وہ روزہ نہ رکھیں) اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا کھلانا۔''

ان آیات کی تفسیر میں' جیسا کہ عرض کیا گیا' مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ میں نے اپنے مطالعے کے بعد جو رائے قائم کی ہے میں صرف وہی بیان کر رہا ہوں کہ اُس وقت امام رازیؒ کے بقول یہ فرضیت علی التعیین نہیں تھی بلکہ علی التخییر تھی۔ یعنی روزہ فرض تو کیا گیا ہے لیکن اس کا بدل بھی دیا جا رہا ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کی استطاعت کے باوجود نہیں رکھنا چاہتے تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دو۔ چونکہ روزے کے وہ پہلے سے عادی نہیں تھے' لہٰذا انہیں تدریجاً اس کا خوگر بنایا جا رہا تھا۔

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ﴾ ''اور جو اپنی مرضی سے کوئی خیر کرنا چاہے تو اس کے لیے خیر ہے۔''

اگر کوئی روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوگا۔

﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾﴾ ''اور روزہ رکھو' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔''

یہاں بھی ایک طرح کی رعایت کا انداز ہے۔ یہ دو آیات ہیں جن میں میرے نزدیک روزے کا پہلا حکم دیا گیا' جس کے تحت رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان نے ہر مہینے میں تین دن

کے روزے رکھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان روزوں کا حکم رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کو اپنے طور پر دیا ہو اور بعد میں ان آیات نے اس کی توثیق کر دی ہو۔

اب وہ آیات آ رہی ہیں جو خاص رمضان کے روزے سے متعلق ہیں۔ ان میں سے دو آیات میں روزے کی حکمت اور غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ پھر ایک طویل آیت روزہ کے احکام پر مشتمل ہے اور آخر میں ایک آیت گویا ٹمس ٹیسٹ ہے۔

آیت ۱۸۵ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''

﴿هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ﴾ ''لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ۔''

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ﴾ ''تو جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے (یا جو شخص بھی اس مہینے میں مقیم ہو) اس پر لازم ہے کہ روزہ رکھے۔''

اب وہ وجوب علی التخییر کا معاملہ ختم ہو گیا اور وجوب علی التعیین ہو گیا کہ یہ لازم ہے' یہ رکھنا ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ﴾ ''اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔''

یہ رعایت حسب سابق برقرار رکھی گئی۔

﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ ''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ سختی نہیں چاہتا۔''

لوگ خواہ مخواہ اپنے اوپر سختیاں جھیلتے ہیں' شدید سفر کے اندر بھی روزے رکھتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنے کی اجازت دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں ان لوگوں پر کافی سرزنش کی جنہوں نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ آپؐ صحابہ کرام ؓ کے ہمراہ جہاد و قتال کے لیے نکلے تھے کہ کچھ لوگوں نے اس سفر میں بھی روزہ رکھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفر کے بعد جہاں منزل پر جا کر خیمے لگانے تھے وہ نڈھال ہو کر گر گئے اور جن لوگوں کا روزہ نہیں تھا انہوں نے خیمے لگائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَیْسَ مِنَ

الْبِرِّ الصَّوْمُ فِی السَّفَرِ)) (۱) ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے''۔ لیکن ہمارا نیکی کا تصور مختلف ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ خواہ ۱۰۵ بخار چڑھا ہوا ہو وہ کہیں گے کہ روزہ تو میں نہیں چھوڑوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی رعایت سے فائدہ نہ اٹھانا ایک طرح کا کفرانِ نعمت ہے۔

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ ''تاکہ تم تعداد پوری کرو''

مرض یا سفر کے دوران جو روزے چھوٹ جائیں تمہیں دوسرے دنوں میں ان کی تعداد پوری کرنی ہوگی۔ وہ جو ایک رعایت تھی کہ فدیہ دے کر فارغ ہو جاؤ وہ اب منسوخ ہو گئی۔

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ ''اور تاکہ تم بڑائی کرو اللہ کی اس پر جو ہدایت اُس نے تمہیں بخشی ہے''

﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾﴾ ''اور تاکہ تم شکر کر سکو۔''

وہ نعمتِ عظمیٰ جو قرآن حکیم کی شکل میں تمہیں دی گئی ہے' تم اس کا شکر ادا کرو۔ اس موضوع پر میرے دو کتابچوں ''عظمتِ صوم'' اور ''عظمتِ صیام و قیامِ رمضانِ مبارک'' کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ ان میں یہ سارے مضامین تفصیل سے آئے ہیں کہ روزے کی کیا حکمت ہے' کیا غرض و غایت ہے' کیا مقصد ہے اور آخری منزل کیا ہے۔ مطلوب تو یہ ہے کہ تمہارا یہ جو جسمِ حیوانی ہے' یہ کچھ کمزور پڑے اور روحِ ربانی جو تم میں پھونکی گئی ہے اسے تقویت حاصل ہو۔ چنانچہ دن میں روزہ رکھو اور اس حیوانی وجود کو ذرا کمزور کرو' اس کے تقاضوں کو دباؤ۔ پھر راتوں کو کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کا کلام سنو اور پڑھو' تاکہ تمہاری روح کی آبیاری ہو' اس پر آبِ حیات کا ترشح ہو۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود تمہارے اندر سے تقرب الی اللہ کی ایک پیاس ابھرے گی۔

آیت ۱۸۶ ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجیے کہ) میں قریب ہوں۔''

میرے نزدیک یہ دنیا میں حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب قول النبی ﷺ لمن ظلل علیه واشتد الحر لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِی السَّفَرِ۔ واللفظ له۔ وفی روایة المسلم : ((لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ اَنْ تَصُوْمُوْا فِی السَّفَرِ)) کتاب الصیام' باب جواز السفر والفطر فی شهر رمضان للمسافر.....

ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔ فصل اگر ہے تو وہ تمہاری اپنی خباثت ہے۔ اگر تمہاری نیت میں فساد ہے کہ حرام خوری تو کرنی ہی کرنی ہے تو اب کس منہ سے اللہ سے دعا کرو گے؟ لہٰذا کسی پیر کے پاس جاؤ گے کہ آپ دعا کر دیجئے' یہ نذرانہ حاضر ہے۔ بندے اور خدا کے درمیان خود انسان کا نفس حائل ہے اور کوئی نہیں' ورنہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو یہ ہے کہ:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے' راہ رو منزل ہی نہیں!

اُس تک پہنچنے کا واسطہ کوئی پوپ نہیں' کوئی پادری نہیں' کوئی پنڈت نہیں' کوئی پروہت نہیں' کوئی پیر نہیں۔ جب چاہو اللہ سے ہم کلام ہو جاؤ۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے؟
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ میرا ہر بندہ جب چاہے' جہاں چاہے مجھ سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔

﴿اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ ''میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے''

''اجابت'' کے مفہوم میں کسی کی پکار کا سننا' اس کا جواب دینا اور اسے قبول کرنا' یہ تینوں چیزیں شامل ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط عائد کی جا رہی ہے:

﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ﴾ ''پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں''
﴿وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ﴾ ''اور مجھ پر ایمان رکھیں''

یہ یک طرفہ بات نہیں ہے' بلکہ یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔ جیسے ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾ ''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا'' تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہاری قدر دانی کروں گا۔ تم میری طرف چل کر آؤ گے تو میں دوڑ کر آؤں گا۔ تم بالشت بھر آؤ گے تو میں ہاتھ بھر آؤں گا۔ لیکن اگر تم رُخ موڑ لو گے تو ہم بھی رُخ موڑ لیں گے۔ ہماری تو کوئی غرض نہیں ہے' غرض تو تمہاری ہے۔ تم رجوع کرو گے تو ہم بھی رجوع کریں گے۔ تم توبہ کرو گے تو ہم اپنی نظر کرم تم پر متوجہ کر دیں گے۔ سورۂ محمدؐ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْکُمْ﴾ (آیت ۷) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا''۔ لیکن اگر تم اللہ

کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاؤ' ان کے ساتھ تمہاری ساز باز ہو اور کھڑے ہو جاؤ قنوتِ نازلہ میں اللہ سے مدد مانگنے کے لیے تو تم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا؟ پہلے اللہ کی طرف اپنا رُخ تو کرو' اللہ سے اپنا معاملہ تو درست کرو۔ اس میں یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ پہلے ولی کامل بن جاؤ' بلکہ اُسی وقت خلوصِ نیت سے توبہ کرو' سارے پردے ہٹ جائیں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴾ ''تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔''

اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے اور اس کے احکام پر چلنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ رشد و ہدایت کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

آیت ۱۸۷ ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ ''حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لیے روزے کی راتوں میں بے حجاب ہونا اپنی بیویوں سے۔''

احکامِ روزہ سے متعلق یہ آیت بڑی طویل ہے۔ یہود کے ہاں شریعت موسوی میں روزہ شام کو ہی شروع ہو جاتا تھا اور رات بھی روزے میں شامل تھی۔ چنانچہ تعلق زن و شو بھی قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے ہاں سحری وغیرہ کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ جیسے ہی رات کو سوتے روزہ شروع ہو جاتا اور اگلے دن غروبِ آفتاب تک روزہ رہتا۔ ہمارے ہاں روزے میں نرمی کی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ رات کو روزے سے خارج کر دیا گیا۔ روزہ بس دن کا ہے اور رات کے وقت روزے کی ساری پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رات کو تعلق زن و شو بھی قائم کیا جا سکتا ہے اور کھانے پینے کی بھی اجازت ہے۔ لیکن بعض مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ہمارے ہاں بھی روزے کے وہی احکام ہیں جو یہود کے ہاں ہیں۔ اس لیے ایسا بھی ہوتا تھا کہ روزوں کی راتوں میں بعض لوگ جذبات میں بیویوں سے مقاربت کر لیتے تھے' لیکن دل میں سمجھتے تھے کہ شاید ہم نے غلط کام کیا ہے۔ یہاں اب ان کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تمہارے لیے روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ''وہ پوشاک ہیں تمہارے لیے اور تم پوشاک ہو اُن کے لیے۔''

یہ بڑا لطیف کنایہ ہے کہ وہ تمہارے لیے بمنزلۂ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلۂ لباس ہو۔ جیسے لباس میں اور جسم میں کوئی پردہ نہیں ایسے ہی بیوی میں اور شوہر میں کوئی پردہ نہیں ہے۔

خود لباس ہی تو پردہ ہے۔ ویسے بھی مرد کے اخلاق کی حفاظت کرنے والی بیوی ہے اور بیوی کے اخلاق کی حفاظت کرنے والا مرد ہے۔ مجھے اقبال کا شعر یاد آ گیا:۔

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

بہرحال مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے ایک ضرورت بھی ہیں اور ایک دوسرے کی پردہ پوشی بھی کرتے ہیں۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اللہ کے علم میں ہے کہ تم اپنے آپ کے ساتھ خیانت کر رہے تھے''

تم ایک کام کر رہے تھے جو گناہ نہیں ہے، لیکن تم سمجھتے تھے کہ گناہ ہے، پھر بھی اس کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اس طرح تم اپنے آپ سے خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے۔

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو اللہ نے تم پر نظر رحمت فرمائی''

﴿وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ ''اور تمہیں معاف کر دیا۔''

اس سلسلے میں جو بھی خطائیں ہوگئی ہیں وہ سب کی سب معاف سمجھو۔

﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ ''تو اب تم ان کے ساتھ تعلق زن و شو قائم کرو''

﴿وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اور تلاش کرو اس کو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔''

یعنی اولاد جو تعلق زن و شو کا اصل مقصد ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق زن و شو کو سکون و راحت کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ﴿لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس تعلق کے بعد اعصاب کے تناؤ میں ایک سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس میں یہی حکمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ہر سفر میں ایک زوجہ محترمہ کو ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ قائد اور سپہ سالار کو کسی وقت کسی ایسی پریشان کن صورت حال میں فیصلے کرنے پڑتے ہیں کہ جذبات پر اور اعصاب پر دباؤ ہوتا ہے۔

﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ واضح ہو جائے تمہارے لیے فجر کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے۔''

یہ پو پھٹنے کے لیے استعارہ ہے۔ یعنی جب سپیدۂ سحر نمایاں ہوتا ہے' صبح صادق ہوتی ہے اُس وقت تک کھانے پینے کی چھوٹ ہے۔ بلکہ یہاں ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ ''اور کھاؤ اور پیو'' امر کے صیغے آئے ہیں۔ سحری کرنے کی حدیث میں بھی تاکید آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہمارے اور یہود کے روزے کے مابین سحری کا فرق ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے: ((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَكَةً)) (۱) ''سحری ضرور کیا کرو' اس لیے کہ سحری میں برکت ہے''۔

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ ''پھر رات تک روزے کو پورا کرو۔''

''رات تک'' سے اکثر فقہاء کے نزدیک غروبِ آفتاب مراد ہے۔ اہلِ تشیع اس سے ذرا آگے جاتے ہیں کہ غروبِ آفتاب پر چند منٹ مزید گزر جائیں۔

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ﴾ ''اور ان سے مباشرت مت کرو جبکہ تم مسجدوں میں حالتِ اعتکاف میں ہو۔''

یہ رعایت جو تمہیں دی جا رہی ہے اس میں ایک استثناء ہے کہ جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو پھر اپنی بیویوں سے رات کے دوران بھی کوئی تعلق قائم نہ کرو۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ ''یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدود ہیں' پس ان کے قریب بھی مت جاؤ۔''

بعض مقامات پر آتا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' پس ان سے تجاوز نہ کرو' ان کو عبور نہ کرو۔ اصلاً حرام تو وہی شے ہوگی کہ حدود سے تجاوز کیا جائے۔ لیکن بہرحال احتیاط اس میں ہے کہ ان حدود سے دور رہا جائے (to keep at a safe distance) آخری حد تک چلے جاؤ گے تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس حد کو عبور نہ کر جاؤ۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ﴾ ''اسی طرح اللہ واضح کرتا ہے اپنی نشانیاں لوگوں کے لیے''

﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ ''تاکہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کر سکیں۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب برکة السحور من غیر ایجاب۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور .....

اب اس رکوع کی آخری آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ تقویٰ کا معیار اور اس کی کسوٹی کیا ہے۔ روزہ اس لیے فرض کیا گیا ہے اور یہ سارے احکام تمہیں اسی لیے دیے جا رہے ہیں تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے ——— اور تقویٰ کا ٹیسٹ ہے ''اکلِ حلال''۔ اگر یہ نہیں ہے تو کوئی نیکی نیکی نہیں ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۸۸ ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اور تم اپنے مال آپس میں باطل طریقوں سے ہڑپ نہ کرو''

﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ﴾ ''اور اس کو ذریعہ نہ بناؤ حکام تک پہنچنے کا''

﴿لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ﴾ ''تاکہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ہڑپ کر سکو گناہ کے ساتھ''

﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور تم اس کو جانتے بوجھتے کر رہے ہو۔''

یہ تقویٰ کے لیے معیار اور کسوٹی ہے۔ جو شخص اکلِ حلال پر قانع ہو گیا اور حرام خوری سے بچ گیا وہ متقی ہے۔ ورنہ نمازوں اور روزوں کے انبار کے ساتھ ساتھ جو شخص حرام خوری کی روش اختیار کیے ہوئے ہے وہ متقی نہیں ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ احکام کی آیات کے درمیان یہ آیت کیونکر آئی ہے۔ اس سے پہلے روزے کے احکام آئے ہیں' آگے حج کے احکام آ رہے ہیں' پھر قتال کے احکام آئیں گے۔ ان کے درمیان میں اس آیت کی کیا حکمت ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جیسے روزے کی حکمت کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ روحِ انسانی میں تقرب الی اللہ کی طلب پیدا ہو جائے اسی طرح احکامِ صوم کا نقطۂ عروج ''اکلِ حلال'' ہے۔

فرمانِ نبوی ﷺ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے''

(رواہ البخاری' عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)